اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ

مخدوم محی الدین

ناشر

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

تعارف

جدید اردو شاعری میں اردو کی قدیم روایات کے احساس کے ساتھ فکر و فن کے نئے رنگ و آہنگ کی بھی جلوہ گری ہے۔ اس شاعری میں موجودہ دور کے سوز و گداز اور اس کی بصیرت و مسرت دونوں کا سامان ملتا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند نے ان انتخابات کی اشاعت کا سلسلہ اس وجہ سے شروع کیا ہے کہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی بنا پر کسی شاعر کا سارا کلام نہیں پڑھ سکتے اس شاعر کے رنگ سے متعارف ہو جائیں اور انھیں اس کے تفصیلی مطالعہ کی خواہش پیدا ہو۔

کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں موجودہ دور کے سارے اہم اور قابلِ ذکر شعرا آجائیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ مقبول ہوگا۔

آل احمد سرور

مخدوم

(انتخابِ کلام مخدوم محی الدین)

انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

بار سوم ۱۹۷۲ء

قیمت: ایک روپیہ

طباعت: لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ

کتابت: اشتیاق حسین رضوی

ترتیب

شاعر

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی، کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا، کچھ کیف اُڑایا بہاروں سے
پھولوں سے مہک، شاخوں سے لچک اور منڈووں سے ٹھنڈا سایہ
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرمایہ
بدمست جوانی سے چھینی کچھ بے فکری، کچھ الّڑھ پن
پھر حُسن جنوں پرور نے دی آشفتہ سری، دل کی دھڑکن
بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چُن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں بیٹھا اک بُت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

میں

تھک کے رہ جاتے ہیں استدلال کے جس جا قدم
ٹوٹ جاتا ہے پہنچ کر جس جگہ منطق کا دَم
خواب تخیل و ہوش کی مجہول تعبیروں سے دُور
فلسفی کی "کس طرح" اور "کیوں" کی زنجیروں سے دُور
میرے رہنے کا جہانِ جاودانی اور ہے
دل کی دنیائے نہاں کی زندگانی اور ہے
خود تراشیدہ بتِ نازآفریں میرا وجود
میری ذاتِ پاک مسجودِ جہانِ ہست و بود
دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں
میرے سجدوں کے لئے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیم انا میں دوسرا کوئی نہیں

یاد ہے

کھیلتا تھا جب لڑکپن سے ترارِ نگیں شباب
ہٹ رہی تھی ماہِ عالم تاب کے رُخ سے نقاب
زندگی تھی حسنِ نو آغاز کا رنگین خواب
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

جب کہ سازِ زندگی نغمات سے معمور تھا
ذرّہ ذرّہ میرے دل کی خاک کا جب طور تھا
میں اکیلا ہی نہیں سارا جہاں مسرور تھا
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

کھیلتی تھی نوجوانی جب کہ ہاتھوں میں تری
زندگی کی بارشیں تھیں جلوہ گاہوں میں تری
رقص کرتی تھیں تمنائیں نگاہوں میں تری
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہر ادائے حسن پر ہوتا تھا دل جب بے قرار
جب رہا کرتا ملاقاتوں کا اکثر انتظار
جب طبیعت تجھ سے ملنا چاہتی تھی بار بار
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

رات بھر سونے نہ دیتی تھی مسرّت عید کی
جب کہ رہتی تھی دلوں میں بے قراری دید کی
ماہتابِ عید بن جاتی کرن خورشید کی
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

رات آتی تھی سنانے سوز کا پیغام جب
مشقِ تحریرِ جنوں بنتا تھا تیرا نام جب
تھا نہ کچھ پیشِ نظر اس عشق کا انجام جب
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے؟

طوُر

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے، ناز و انداز و حیا میں نے
یہیں کی جرأتِ اظہارِ حرفِ مدعا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

دلوں میں اژدہامِ آرزو، لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی، دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی، نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

وہ کیا آنا کہ گویا دَور میں جامِ شراب آنا
وہ کیا آنا، رنگیلی راگنی، رنگیں رباب آنا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آنا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مستِ شباب آنا
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پہ لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
خفائے راز کی پُرلطف باہم کوششیں ہوتیں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

بہ ہے جانے نئے بیٹھے تعشق کے زرّیں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کر دٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے، غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے، یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں، نہ وہ آبِ رواں باقی
مگر اُس عیشِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا

نظریں نیچی کیے، شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

آ گئی تھی دل مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے
میرے مسجود مری رُوح پہ چھانے والے
آ کبھی جا ناکہ مرے سجدِ دل کا ارماں نکلے
آ کبھی جاناں ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

دوٗ قطعے

تو نے کس دل کو دُکھایا ہے، تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے، تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے، تجھے کیا معلوم

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں، تو کیا ہوگا
تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ الفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

وہ

وہ خمِ گردن، وہ دستِ ناز، وہ اُن کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلّم، وہ نگاہوں کا پیام

بولتی آنکھوں کا رس، گل رنگ عارض کا جمال
مُسکراتا سا تصوّر، گنگناتا سا خیال

ایک ایسا غم، جو آنسو بن کے بہہ سکتا نہیں
دل جسے محسوس کر سکتا ہے، کہہ سکتا نہیں

اور کیا ہو گی کسی کی کائناتِ سال و سِن
عشق کی دو چار راتیں، حُسن کے دو چار دن

آہ پہلے نارسا تھی، اب کہیں رُکتی نہیں
اب کسی کے آستانے پر جبیں جھکتی نہیں

قلندر

(چغتائی کی ایک تصویر کو دیکھ کر)

تری نظروں کی زد کو آسماں والوں سے پوچھوں گا
مکاں والوں سے کیا، میں لامکاں والوں سے پوچھوں گا
ہنر ور کو صلہ صنعت گری کا مل گیا ہوگا
قلندر کی نظر کو دیکھ کر دل ہل گیا ہوگا
جنوں کو عام کر دے، دہر کو زبر و زیر کر دے
ان ہی بیباک نظروں کو ذرا بیباک تر کر دے
غلط آہنگ سازِ زندگی برباد ہو جائے
جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے
ترا رقصِ جنوں ہم سازِ اسرافیل ہو جائے
یہ بزمِ غیر، بزمِ خاص میں تبدیل ہو جائے

جنگ

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی
عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس
کیوں رُک رہی ہے سینہ میں تہذیبِ نو کے سانس
امن و اماں کی نبض چھٹی جا رہی ہے کیوں
بالینِ زیست، آج اجل گا رہی ہے کیوں
اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں نہ دل کی آگ

بربط نوازِ بزمِ الوہی اِدھر تو آ
دعوت دہِ پیامِ عبودی اِدھر تو آ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ

معصومۂ حیات کی بے چادری تو دیکھ
دستِ ہوس سے حسن کی غارت گری تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

اے آفتابِ رحمتِ داور طلوع ہو
اے انجمِ حمیتِ یزداں طلوع ہو

جہانِ نو

نغمے شرر فشاں ہوں، اُٹھا آتشیں رباب
مضرابِ بے خودی سے بجا سازِ انقلاب
معمارِ عہدِ نو ہو ترا دستِ پُر شباب

باطل کی گردنوں پہ چمک، ذوالفقار بن

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

ٹوٹے ہوئے تارے

کہا ہے مجھ سے یہ ٹوٹے ہوئے ستاروں نے
فلک کی گود سے چھوٹے ہوئے ستاروں نے
نوائے درد بھری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیلِ رواں میں ڈوب گئی
سمن برانِ فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمیں والوں کے دل کو، نظر کو دیکھ لیا
وہ میری آہ کا شعلہ تھا، کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاکداں کا مسافر تھا، مہ پارہ نہ تھا
دلوں میں بیٹھ گیا تیرِ آرزو بن کر
فلک پہ پھیل گیا عشق کا لہو بن کر

یہ ساکنانِ فلک درد و غم کو کیا جانیں
یہ خاکیوں کی رہ بیش و کم کو کیا جانیں
وہ غم کو پی نہ گئے، آنسوؤں کو پی نہ سکے
زمیں کے زہر کو پی کر وہ اور جی نہ سکے
فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے
زمیں پہ ڈھیر ہوئے تیر آہ کے مارے
یہ آگ اور بھی اوپر نکل گئی ہوتی
حریم عرش کو چھو کر نکل گئی ہوتی

ستارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو، جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

رات رات بھر جاگ جاگ کر کس کو گیت سناتے ہو
چھپ چھپ رہ کر جھل مل جھل مل کس بھاشا میں گاتے ہو

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو، جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

رات اندھیری کالی کس سج دھج سے آئی ہے
میرا کیا ہیں سودائی تاروں کی رسوائی ہے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو، جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

ہم جس نگری میں رہتے ہیں وہ نگری کیا دیکھو گے
ہم جس بستی میں بستے ہیں وہ بستی کیا دیکھو گے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو، جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

آپ تن آساں راج دلارے میں وحشی طوفان بدوش
میری دنیا جدلِ مسلسل، آپ کی دنیا سیلِ خموش
جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو، جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

جھوم جھوم کر گرج گرج کر بادل بن کر چھانا ہے
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں میں امرت رس برسانا ہے
جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو، جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

مشرق

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکان
زندگانی تازگی عقل و فراست کا مسان
وہم زا، افسردہ خداؤں کا، روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
گھٹتی ہے سانس سینے میں، مریضِ دق کو دیکھ
ایک ننگی نعش، بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے رُوح خول
ایک مرگِ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

دھواں

جنتیں خاک پہ جس رات اُتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں
عشرت و عیش کی بس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشمِ گنہ گار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میّت کا دُھواں

حویلی

ایک بوسیدہ حویلی، یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا، جس طرف دیکھو کھنڈر
مار و کژدم کا ٹھکانا جس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک، کتنے ہولناک
جن میں رہتے ہیں مہاجن، جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن، جن میں کعبہ کے فقیر
رہزنوں کا قصرِ شورٰی، قاتلوں کی خوابگاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم، جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا، ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا

زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ
سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال
ایک جانب ہیں وہی ان بے نواؤں کے گروہ
ہاں ان ہی بے نان و بے پوشش گداؤں کے گروہ
جن کے دل کچلے ہوئے، جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال
اے خدائے دو جہاں، اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے
جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہمدم کون ہے
کون ہے پروردگارِ بزمِ ماتم کون ہے
کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اے جواں سالِ جہاں، جانِ جہانِ زندگی
ساربانِ زندگی، رُوحِ روانِ زندگی
جس کے خونِ گرم سے بزمِ چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفس سے گلستاں زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں، زلزلے جس کے سفیر
جس کا دل خیبر شکن، جس کی نظر ارجن کا تیر
آ، اِن ہی کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ، اِن ہی کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

آتش کدہ

کیا کہوں کن دلبرانِ خاص کی محفل میں ہوں
کیا بتاؤں کن نگاہوں میں، ہوں، کیسے دل میں ہوں
واجب و امکان کی کس حد میں ہوں میں کیا کہوں
کیسی کیسی بجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں
کتنے لب، کتنی جبینیں، کتنے جلوے، کتنے طور
کتنی صبحوں کا اُجالا، کتنے نغموں کا سرور
کتنی نو آغاز کلیاں، کتنے خوشبو دار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول
کتنے سنگیں دل ہیں جو میرے نشہ میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں
کیا کہوں کن عارضوں، کن کاکلوں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن مہ وشوں، کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے، یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے، یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر

میتیں ہات کٹے، پاؤں کٹے
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی، کبھی ماؤں کی
چاند کے، تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

انقلاب

ے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
جومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ر تابناکیٔ رُخ ہے، نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرّہ ذرّہ پریشاں، کلی کلی مغموم
ے کُل جہاں متعفن، ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رخِ حیات یہ کاکل کی برہمی ہی نہیں
نگارِ دہر میں اندازِ مریمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سر دل میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
تو ہمات کا آدم غلام ہے اب تک
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
تشنیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

جنگِ آزادی

یہ جنگ ہے، جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی، مزدوروں کی
یہ جنگ ہے، جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
سارا سنسار ہمارا ہے پورب، پچھم، اتر، دکھن
ہم افرنگی، ہم امریکی ہم چینی، جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن آہن پیکر، فولاد بدن
یہ جنگ ہے، جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

وہ جنگ ہی کیا، وہ امن ہی کیا دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا، دنیا کیا ہوگی جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا مزدور کا جس میں راج نہ ہو

یہ جنگ ہے، جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا

یہ جنگ ہے، جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی، مزدوروں کی

یہ جنگ ہے، جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

کہو ہندوستاں کی جے

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے
قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی، قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی
کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کا پاسباں وہ تیغ جوہردارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمع زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی نازطوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ براندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی
کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

مستقبل

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آواز پا آ رہی ہے
بُلاتا ہے کوئی، ندا آ رہی ہے

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

نہ سلطانی و قیصری ہے، نہ زاری
نہ تختِ سلیماں، نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں، نہ شاہی سواری

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

اڑاتا ہوا پرچم زندگانی
سناتا ہوا عہدِ نو کی کہانی
جلو میں ظفر مندیاں، شادمانی

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے چلا آرہا ہے

قید

قید ہے، قید کی میعاد نہیں
جور ہے، جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے، رات کی خاموشی ہے، تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لَو
جاگ اٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی اِک اِک بات کی یاد آتی ہے

شاہراہوں میں، گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش

ان کی نظروں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جبرِ شاہی سے غمیں، جَورِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ وہ زہر سے دھماکا بن جائیں

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھ کو غم ہے کہ میرا گنجِ گرانمایہ مگر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

چارہ گر

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور، اُس موڑ پر

دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چتا

دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو، تازہ دم پھول، پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو، چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ، گرم رخسار پر

ایک پل کے لیے رُک گئی
ہم نے دیکھا اُنھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا اُنھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا اُنھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا اُنھیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے اُلفت بھی ہے
اِک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دُور، اُس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
چارہ گر!

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے، بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے، دور سے آئی ہے، مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی، اجالوں کا سلام آئے گا
آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
سازو آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی، آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے، زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لئے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

فردیات

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو ۔۔۔ چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال ۔۔۔ جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

کدھر چلا دلِ دیوانہ لے کے عزمِ کلیم ۔۔۔ گدائے راہ کہاں، اس کی بارگاہ کہاں

بات کیا تھی، ذکر کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط ۔۔۔ مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی ۔۔۔ جیسے وہ خود ساتھ ہیں، ان کی جوانی ساتھ ہے

بنتے ہی بگڑتے رہے، کاروبارِ شوق ۔۔۔ اک ہم کہ آرزو کا سہارا لیے رہے

میری آنکھوں کی زباں اور مرے دل کی آواز ۔۔۔ نہ سمجھنے کے لئے ہے، نہ سنانے کے لئے ہے

تلنگن

بکھرے والی کھیت کے مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی، اوروں سے شرماتی ہوئی

اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

ارض پُرگوش ہے، خاموش ہیں سب آسماں
راگ سُننے رُک گئے ہیں، بادلوں کے کارواں
ہاں ترانہ چھیڑ جنگل کا مری غنچہ دہاں

اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دیکھنے آتے ہیں تارے شب میں سُن کر تیرا نام
جلوے صبح و شام کے ہوتے ہیں تجھ سے ہم کلام
دیکھ فطرت کر رہی ہے تجھ کو جھک جھک کر سلام
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دخترِ پاکیزگی، نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کلی، تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

لے چلا جاتا ہوں آنکھوں میں لئے تصویر کو
لے چلا جاتا ہوں پہلو میں چھپائے تیر کو
لے چلا جاتا ہوں، بھیلا راگ کی تنویر کو
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

سجدہ

پھر اُسی شوخ کا خیال آیا — پھر نظر میں وہ خوش جمال آیا

پھر تڑپنے لگا دلِ مضطر — پھر برسنے لگا ہے دیدۂ تر

یاد آئیں وہ چاندنی راتیں — وہ ہنسی، چھیڑ، دل لگی باتیں

شبِ تاریک ہے، خموشی ہے — کُل جہاں محوِ عیش کوشی ہے

لطف سجدوں میں آ رہا ہے مجھے — چھپ کے کوئی بُلا رہا ہے مجھے

چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی — آئی آواز اس کی باتوں کی

اڑ رہا ہے غبارِ نورِ بدن — پھیلتی جا رہی ہے بوئے بدن

موجِ تسنیم و کیفِ خلدِ بریں — جگمگاتا بدن، چمکتی جبیں

اپنے آنچل میں منہ چھپائے ہوئے — آ رہا ہے قدم بڑھائے ہوئے

نغمے پازیب کے سناتے ہوئے — بختِ خفتہ مرے جگاتے ہوئے

عشوۂ و ناز کا فسوں لے کر — ساتھ اک لشکرِ جنوں لے کر

زور سے مسکراتا آتا ہے — بجلیاں سی گراتا آتا ہے

وہ کہ رنگیں کرن تبسم کی — اک مسلسل لڑی ترنم کی

پردۂ تن میں راگ پوشیدہ　　　راگ وہ جس میں آگ پوشیدہ
بانسری سی بجائے جاتا ہے　　　آگ تن میں لگائے جاتا ہے
ایک دنیائے رنگ و بو، بن کر　　　خوں شدہ دل کی آرزو بن کر
نئی دلہن کی تھرتھری بن کر　　　اس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر

میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

انتساب

ہم کو بے مائگیٔ ضبط دکھانا ہی پڑا　　　دل کی باتوں کو ترے سامنے لانا ہی پڑا
میں جو خلوت میں بھی ڈرتا تھا سنانے کے لیے　　　سر بازار وہی گیت سنانا ہی پڑا
کھینچ لایا تجھے پردے سے مرا ذوقِ نیاز　　　میرے پردے میں تجھے جلوہ دکھانا ہی پڑا

تھرتھرانے ہوئے ہاتھوں سے، دھڑکتے دل سے
تیرے رُخ سے ترے آنچل کو ہٹانا ہی پڑا

پُرسہ

(بچے کے انتقال پر ماں کے حضور میں)

نہ رو ہم نشیں، یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے

ترے دل کی ٹھنڈک کو ناروں میں ڈھونڈا
ترے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا

ترے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
ترے دل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا

بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں
نہ تیری ہوائیں، نہ میری ہوائیں

مُرادوں کو بَر لانے والی دعائیں
نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں

دعائیں بھی بے بس، ہوائیں بھی بے بس
تری اور مری التجائیں بھی بے بس

نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مصوّر کا ہر نقش فانی

قمر

شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آ رہا ہے قمر
زمیں پہ نور کی چادر بچھا رہا ہے قمر

درخت چاند کے، ان کے ثمر بھی چاند ہی کے
ہر اک حسیں کو حسیں تر بنا رہا ہے قمر

حیاتِ نو مجھے آواز دے رہی ہے اٹھو
دبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر

نگاہِ یار سے جا جا کے مل رہی ہے نگاہ
جنون و حسن کو باہم ملا رہا ہے قمر

کسی کا روئے حسیں پھر رہا ہے آنکھوں میں
رُلا رُلا کے مجھے مسکرا رہا ہے قمر

بھلا رہا تھا جسے میں فریب دے دے کر
وہی حکایتِ شیریں سنا رہا ہے قمر

فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے جزیرے ہیں
زمیں کے درد کو اوپر بلا رہا ہے قمر

یہ کس غریب کے سینہ میں ہوک اٹھتی ہے
لرز رہے ہیں محل، تھرتھرا رہا ہے قمر

اداس رات ہے، افلاس ہے، غلامی ہے
کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

کہاں ہے ساقیِ گل رو، کہاں ہے سرخ شراب
فسانۂ غمِ گیتی سنا رہا ہے قمر

پشیمانی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے، ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں

جب دلِ ناداں یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں

شب کے سناٹے میں چپکے چپکے رو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے، لب پر مناجاتیں نہ تھیں

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں، ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

روحِ فغفور

دخترِ خواجگی، روحِ غارت گری ‏— موت کی ہم سفر، مرگھٹوں کی پری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر ‏— کچھ بچاری ادھر، کچھ بچاری ادھر
وہ شبِ اندام، وہ قبر کی تیرگی ‏— میرے گھر میں وہ کل یک بیک گھس گئی
ناچتی، کودتی، شور کرتی ہوئی ‏— میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوئی
پرچمِ غم ہوا میں نچاتی ہوئی ‏— مسکراتی ہوئی، کھلکھلاتی ہوئی
ایڑیوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی ‏— خون پی پی کے گرتی، ابھرتی ہوئی
موت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دم بدم ‏— اے مری ہم نفس، اے مری ہم قدم
تیرے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ‏— کونسی وہ بلا ہے، جو مجھ میں نہیں
کیا مجھے جورِ ارضی نے پالا نہیں ‏— کیا یہ انسان میرا نوالا نہیں

پشتِ گیتی پہ جب تھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں "روحِ فغفور" ہوں

زلفِ چلیپا

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام

آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات میں
اب تو بوئے آتش و بارود ہے ہر بات میں

کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
زرِ نگینی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج

موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات

جس زمیں سے ارتقائے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں، کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمدؐ کی زمیں، وہ ابنِ مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے

مندروں میں، معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت
خلوتوں میں موت ہے، شاہی شبستانوں میں موت

زرگری کا رقص ہے، سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے

اب کسی سینے میں روحِ شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلکی جھلک نظر آتی نہیں

برہمیِ زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمائے کا نام
موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام

عزمِ آزادی سلامت، زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زندہ باد

اِستالین

(قازقستان کے تاتاری شاعر جابر جمبول کی نظم کا آزاد ترجمہ)

حشفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر
اِستالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو،
جس کی بنیاد میں جمہور کا عرق
اُن کی محنت کا، اخوت کا، محبت کا خمیر

وہ زمیں
اُس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

مرے پیارے، مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگامِ قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی، دمِ مسرت بن کر
نہ سما جائے گا؟
قرۃ العین! مری جانِ عزیز
او مرے فرزندو!
برق پا دہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں اسٹالین

وہ مرا ملکِ جواں
وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبو
مری نوخیز مسرت کا جہاں
وہ مرا مردِ رواں ملکِ جواں
ولد الحرم خطاکار درندوں نے جہاں
اپنے ناپاک ارادوں سے قدم رکھا ہے
ایک نوخیز کلی، ایک نو آغاز بشر

وہ مرا مُلکِ جواں

سچ کہا ہے کہ "زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر
تھرتھراتے ہوئے، سہمے ہوئے، گھبرائے ہوئے
نکل آئے ہیں بلوں سے باہر"
اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کرو
اور فاشسٹ شغالوں سے کہو
لقمۂ اول و آخر ہے یہی
قرۃ العین! مری جانِ عزیز
او مرے فرزندو!
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے ننھے تو نہال کو بجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین
یہی محشر ہے، دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں

دوسرا۔ ایک ابھرتے ہوئے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے یہ نجس اور ناپاک
سوسمار
دورِ وحشت کے درندے
موذی
دہنِ آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر
مرے شاہیں کے خلاف
رات دن ہیں کہ چلے آتے ہیں
نہیں جائیں گے کبھی رائیگاں میرے نغمے
اور مرے ہم وطنوں کے نغمے
مرے شاہین تو منصور و مظفر ہی رہیں گے دائم
سوسماران خزندہ درگور
مرا شاہین، مرا استالین
مرے شاہین بچے جن کا ابھی نام نہیں
سرخرو اور سرافراز فضاؤں میں بلند
ہاں مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو مہمیز کرو

سُرخ فوجوں میں ملو
جوئے پُر جوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے، پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود کھجور بن جاؤ
اور فاشسٹ خنازیر کو
فی النّار کرو
میرے بلخاش کہاں ہے وہ مِس سُرخ ترا
اس سے کہنا مرے دشمن پہ گرے سِل بن کر
بحرِ اخضر کے اوباکِ اگیر دا! غوطہ زنو!
اپنا ذخیرہ لاؤ
اور قربانِ وطن کر ڈالو
معدنوں سے کہو اور کھیتوں کو آواز نو دو
لائیں وہ اپنے سِن دسال کا حاصل لائیں
اور قربانِ وطن کر ڈالیں
یہ میا رہوار، یہ پشمینہ ہے، یہ خرمن ہیں
مرے محبوب وطن
سب کے سب تیرے ہیں، سب تیرے ہیں
استالین نے میدان میں بلایا ہے ہمیں
کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر

قازقستان !

وطن

اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اٹھ

خیز باصد حشم و جاہ و جلال

بہ ہزاراں جبروت

ایک جاں، ایک جسد

پھونک دے دشمنِ ناپاک کی خاکستر کو

ولی

جہانِ رنگ و بو سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی
شبِ ہجراں کی سختی سے کھیلنے والا نہ تھا کوئی

زبانِ نغمہ بے تاثیر تھی مستی کی پیاسی تھی
پریشاں گیت تھے گیتوں کے چہرے پر اداسی تھی

ترانے حسن و دل کے گانے والا ہی نہ تھا کوئی
حسیں فطرت کو بھی بہلانے والا ہی نہ تھا کوئی

اک ایسی ترجمانی چاہتے تھے راز فطرت کے
کبھی داؤد کے محتاج تھے سب ساز فطرت کے

ابھی نا آشنائے لذتِ گفتار تھی دنیا
اسیرِ خامشی تھی، بار تھی، آزار تھی دنیا

یکایک دہرِ تیرہ بخت کی قسمت بدلتی ہے
ہوا بھی زیرِ لب ہنستی ہوئی، اترائی چلتی ہے

پگھل کر بہہ چلے موسیقیوں کے منجمد دھارے
اٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے بستر سے فوارے

وہ پیغامِ سحر آیا گیا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ ابھرا مہر، لو وہ زندگانی کی کرن پھوٹی

حجابِ تیرگی قدرت نے جب چہرے سے سرکایا
تو گہوارے میں اک ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا

فضائیں احتراماً سر پہ آنچل ڈال دیتی ہیں
سحر کی بیٹیاں زلفوں کی مانگ بھرتی ہیں

صدا دی آسمانوں نے، ستاروں نے ولی آیا!
مبارکبادیاں گائیں بہاروں نے ولی آیا!

ولی وہ ہمدمِ فطرت، وہ پیکِ نورِ وجدانی
وہ جبریلِ سخن وہ اولیں تلمیذِ رحمانی

یقیں بخشا زباں کو جس نے پہلے اس کے جینے کا
وہ پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا

دیئے روشن کئے مندر میں کہ کے چراغوں سے
ہزاروں جنتیں آباد کردیں دل کے داغوں سے

وہ میراث جہاں دخلد کا پیغام آتا ہے
دکن کی سرزمیں پہ زندگی کا جام آتا ہے

اقبال

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانبِ مشرق اجالا سا نظر آنے لگا

موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں

اک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا

عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے

پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے نور پر گاتا ہوا پایا گیا

وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا
کو بہ کو، کوچہ بہ کوچہ، در بدر گاتا گیا

گیت سننے کے لیے خلقِ خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی

نغمۂ جبریل ہے، انساں کا گانا نہیں
صورِ اسرافیل ہے، دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی تمہید ہے، اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے، سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

جوانی

بیدار ہوئیں مہرِ جوانی کی شعاعیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں

خوابیدہ تھے جذبات، بدلنے لگے کروٹ
روئے ثمرِ طور سے ہٹنے لگا گھونگھٹ

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بندِ قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

ساغر کی کھنک بن گئی اس شوخ کی آواز
بربط کو ہوئی گدگدی یا جاگ اٹھے ساز

اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے، تو بجلی ہے نظر میں

آنے لگی ہر بات پہ رک رک کے ہنسی اب
رنگین نموِ تن سے گراں بار ہوئے لب

وہ دیکھ بدلتے ہوئے پہلو کوئی اٹھا
وہ دیکھ بگاڑے ہوئے گیسو کوئی اینٹھا

وہ دیکھ کہ کس گل کی مہک پھیلی ہے ہر سو
وہ دیکھ کہ ہے کون رواں بجتے ہیں گھنگرو

کم بخت اجل تھی یہ جوانی کی قبا میں
ٹکڑے ہیں کسی دل کے بھی نقشِ کفِ پا میں

سپاہی

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

شعراء کے انتخابی سلسلے

اختر شیرانی، فیض، مجاز، مخدوم، جذبی، احمد ندیم قاسمی، آزاد،
کیفی، عرش، وجد، مجروح، اثر، جاں نثار اختر، اختر انصاری، اصغر گونڈوی،
الم مظفر نگری، تاباں، جگر بریلوی، جوہر نظامی، حبیب احمد صدیقی، شاد عارفی،
شفیق جونپوری، شمیم کرہانی، فراق گورکھپوری، ملا، نشور واحدی، یگانہ چنگیزی،
اختر الایمان، عمیق حنفی، جمیل مظہری، کمال احمد صدیقی، ریاض خیرآبادی،
شاد عظیم آبادی اور سلام مچھلی شہری۔ فانی بدایونی۔ علی جواد زیدی۔ بلراج کومل۔

ہر انتخاب کی قیمت ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

مخدوم محی الدین کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد (دکن) کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا۔ چچا کی سرپرستی میں مدرسے اور گھر پر کچھ مذہبی تعلیم حاصل کی اور عربی فارسی سیکھی اور ۱۹۳۷ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا ۱۹۳۳ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا رومانی نظموں سے ہوئی، مگر بہت جلد اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کی طرف مائل ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک کتاب 'ٹیگور اور ان کی شاعری' لکھی۔ کچھ ڈرامے بھی لکھے اور کھیلے۔ ۱۹۴۰ء میں 'مارکسزم' سے روشناس ہوئے ۱۹۳۶ء میں حیدر آباد میں بڑے ناساعد حالات میں انجمن ترقی اردو مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ادب اور طالب علموں کی تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ خفیہ طور پر مارکسی تعلیمات کا ایک حلقہ بنایا۔ پھر کچھ دنوں کی بے روزگاری کے بعد سٹی کالج میں لکچرر ہوگئے۔ ۱۹۴۰ء میں نوکری چھوڑ کر علانیہ کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے، اور بغاوت کے الزام میں تین مہینے کی جیل کاٹی۔ ۱۹۴۶ء میں سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش ہوگئے۔ اور تلنگانے میں کام کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں گرفتار ہوئے اور دسمبر میں چناؤ سے کچھ پہلے رہا ہوئے اور حیدر آباد اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔

۲۵ راگست ۱۹۶۹ء کو انھوں نے دلی میں انتقال کیا۔ مخدوم کے تین مجموعۂ کلام سرخ سویرا گل تر اور بساط رقص شائع ہو کر مقبول خواص و عوام ہو چکے ہیں۔